ڈاکٹر حافظ حسین ازہر[1]

والدین کے معاشی اور مشاورتی حقوق

Abstract

Assessment is an important responsibility of religious rights and duties. Knowledge of rights and obligations will also be possible to pay them. In this paper, the economic and development rights of children, parents have been blown. This issue is discussed in which the wealth of the children how their parents are entitled. And the other issues like marriage and divorce for children to consult their parents or that their advice is not binding.

والدین اولاد کے لیے نعمت عظمیٰ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے محسن اور ہمدرد بھی ہیں اولاد کے عدم سے لے کر ان کے وجود اور وجود ہی نہیں ان کی ساری زندگی اللہ تعالیٰ کے احسان وانعام اور خیر وبرکت کی علامت ہے۔ اسی چیز کو سامنے رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ نے والدین کا نفقہ اولاد پر واجب اور ان کی ذمہ داری قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾[2]

"تیرے رب نے فیصلہ کر دیا کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو، مگر صرف اس کی اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔"

قرآن کریم کی مذکورہ اور دیگر آیات و احادیث میں برالوالدین کا درس دیا گیا ہے اب ہم دیکھتے ہیں کہ برالوالدین کسے کہتے ہیں؟

برالوالدین کا مفہوم

والدین کے ساتھ نیکی کرنا ایک جامع کلمہ ہے جو ہر قسم کی خیر اور پسندیدہ فصل کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے یعنی والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا، ان کا احترام کرنا، ان کے ساتھ ادب سے پیش آنا، ان کے لیے اپنا مال

1 اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ سماجی علوم، یونیورسٹی آف ویٹرنری اینڈ اینمل سائنسز لاہور (پاکستان)

2 سورۃ الاسراء: 17: 23

صرف کرنا، ان کے حقوق کا خیال رکھنا، ان کے لیے پسندیدہ امور کو بجالانا اور ان کی ناپسندیدگی سے بچنا، نافرمانی نہ کرنا اور ان کو کسی قول و فعل سے اذیت نہ دینا وغیرہ۔

مذکورہ سطور میں جن حقوق والدین کا تذکرہ کیا گیا ہے اگر ان کو بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ والدین کے حقوق میں سب سے بڑا حق ان پر ان کے بڑھاپے میں خرچ کرنا ہے، بیٹا خواہ مال دار ہو یا تنگ دست، اور والدین کا مذہب مختلف ہی کیوں نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا﴾[1]

"دنیا میں معروف طریقے سے ان کا ساتھ دو۔"

بلاشبہ دنیاوی ضروریات مال کے بغیر پوری ہو ہی نہیں سکتیں۔

والدین کے معاشی حقوق کی ادائیگی: احادیث کی روشنی میں

نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

« إِنَّ مِنْ أَطْيَبِ مَا أَكَلَ الرَّجُلُ مِنْ كَسْبِهِ وَوَلَدُهُ مِنْ كَسْبِهِ، فَكُلُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ »[2]

"بلاشبہ سب سے پاکیزہ چیز وہ ہے جو انسان اپنی کمائی سے کھائے اور اس کی اولاد اس کی کمائی سے ہی ہے لہٰذا تم ان کا مال کھاؤ۔"

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«أنت و مالك لأبيك»[3] "تم اور تمہارا مال (دونوں) تمہارے والد کے لیے ہیں۔"

مزید برآں نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

«إن أولادكم هبة الله لكم فهم وأموالهم لكم إذا احتجتم إليه »[4]

"بلاشبہ تمہاری اولاد تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے پس وہ اور ان کے اموال تمہارے لیے ہیں جب کہ تم اس کے محتاج ہو۔"

شیخ البانی رحمہ اللہ (متوفی 1420ھ) مذکورہ حدیث مبارکہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ والد اپنے بیٹے کے

---

1 سورة لقمان:31: 15

2 أبو داؤد، سليمان بن الأشعث، سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في الرجل يأكل من مال ولده:3528، دار السلام للنشر والتوزيع، الرياض، الطبعة الأولىٰ، 1999م

3 الألباني، محمد ناصر الدين، إرواء الغليل: 838، المكتبة الإسلامية، بيروت، الطبعة الثانية، 1985م

4 الألباني ، محمد ناصر الدين، سلسلة الأحاديث الصحيحة: 2564، مكتبة المعارف للنشر والتوزيع، الرياض الطبعة الأولىٰ، 1995م

مال سے اپنی مرضی کے مطابق ہر چیز نہیں لے سکتا، بلکہ فی الحقیقت جس چیز کا محتاج ہے وہی لے سکتا ہے۔[1]

امام ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 319ھ) کہتے ہیں کہ اس بات پر اہل علم کا اجماع ہے کہ ایسے تنگ دست والدین، جن کا نہ کوئی ذریعہ معاش ہو اور نہ ہی کوئی مال ہو تو ایسی صورت میں اولاد پر انکا خرچ اور ان (چھوٹے) بچوں کا خرچ بھی واجب ہے جن کے پاس ابھی کوئی مال نہیں۔[2]

علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 620ھ) بھی اسی بات کے قائل ہیں۔ اس بات میں علماو فقہا کا اختلاف ہے کہ اگر بیٹا باپ پر خرچ نہ کرے تو اس کے مال کو استعمال کر سکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر بیٹے کا مال باپ لے سکتا ہے تو کس قدر؟ اس سلسلہ میں فقہاء کے تین اقوال ہیں :

پہلا قول

① باپ کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ضروری نفقہ کے سوا اپنے بیٹے کے مال میں سے کچھ حصہ لے اور وہ بھی اس وقت جب کہ وہ ضرورت مند ہو۔ بیٹے کا مال اسی کی اپنی ملکیت ہے اور باپ کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنی ضرورت سے زیادہ اس کے مال سے کچھ لے البتہ بیٹا اپنی رضامندی سے دے دیتا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

یہ قول جمہور اہل علم یعنی حنفیہ، مالکیہ اور شوافع میں سے اکثر فقہاے کرام کا ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 241ھ) سے بھی اس قول کی ایک روایت موجود ہے جبکہ حنابلہ میں سے ابن عقیل کا بھی یہی قول ہے۔ صحابہ و تابعین میں سے حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کا یہی قول ہے اور کبار فقہاے تابعین قاضی شریح (متوفیٰ 76ھ)، جابر بن زید، محمد بن سیرین (متوفیٰ 110ھ)، حماد بن ابی سلیمان (متوفی 120ھ) اور زہری (متوفیٰ 124ھ) رحمۃ اللہ علیہم کا بھی یہی قول ہے جبکہ ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 715ھ) اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 104ھ) سے بھی ایک ایک روایت مروی ہے اس قول کے قرآن و سنت، اجماع اور عقل و فہم سے دلائل بالترتیب حسب ذیل ہیں۔

قرآن کریم سے دلائل

اللہ تعالی فرماتے ہیں:

﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴾[3]

"لوگ سوال کرتے ہیں کہ ہم کیا خرچ کریں؟ جواب دو کہ جو مال بھی تم خرچ کرو اپنے والدین پر، یتیموں پر، مساکین پر، مسافروں پر خرچ کرو اور جو بھلائی بھی تم کرو گے اللہ تعالی اس سے بخوبی واقف ہے۔"

---

1 سلسلة الأحاديث الصحيحة: 138/6

2 ابن قدامة، أبي محمد عبد الله بن أحمد، المغني: 373/11، للطباعة والنشر والتوزيع، 1989م

3 سورة البقرة:2: 215

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 671ھ) اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"غنی شخص پر واجب ہے کہ وہ اپنے محتاج والدین پر ان کے کھانے، پینے، اوڑھنے وغیرہ پر اتنا خرچ کرے جتنا اپنے اوپر خرچ کرتا ہے۔"[1]

مذکورہ آیت مال پر بیٹے کی ملکیت کو ثابت کرتی ہے اور والدین کو اللہ تعالیٰ نے مصارفِ انفاق میں ذکر کیا ہے لہذا باپ کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے بیٹے کے مال کو اپنی ملکیت بنائے۔ اگر بیٹے کا مال باپ کا ہی ہوتا تو والدین کا نفقہ ثابت نہ ہوتا اور فقہا کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ضرورت مند والدین کا نفقہ بیٹے کے ذمہ واجب ہے۔[2]

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ...﴾[3]

"اگر اس کی اولاد ہو تو اس کے ترکے میں سے ماں باپ ہر ایک کے لئے چھٹا حصہ ہے۔"

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 204ھ) فرماتے ہیں:

"جب اللہ تعالیٰ نے باپ کو بیٹے کی میراث میں سے دیگر ورثاء کی مانند ایک مقرر حصہ دیا ہے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بیٹا بلاشرکت غیر اپنے مال کا خود مالک ہے۔"[4]

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 321ھ) فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے بیٹے کی موت پر ماں کو مقرر حصہ دیا ہے اور یہ امر محال ہے کہ بیٹے کی موت پر ماں کو بیٹے کے مال کی بجائے، باپ کے مال میں سے مقرر حصہ دیا جائے۔"[5]

امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 456ھ) فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے میت کے مال میں والدین، خاوند، بیوی، بیٹے اور بیٹیوں سمیت تمام ورثاء کے حصے مقرر کر دیئے ہیں اگر بیٹے کا مال والد کی ملکیت ہوتا تو مذکورہ تمام ورثاء محروم ہو جاتے کیونکہ وہ ایک زندہ انسان والد کا مال ہوتا۔"[6]

حدیث سے دلائل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« فَإِنَّ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ حَرَامٌ عَلَيْكُمْ،كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا، فِي بَلَدِكُمْ هَذَا، فِي

1 القرطبي، أبو عبد الله محمد بن أحمد، الجامع لأحكام القرآن: 37/3، مكتبة الغزالي، دمشق

2 ابن حزم، علي بن أحمد، المحلى: 107/8، إدارة الطباعة المنيرية، بمصر

3 سورة النساء:4: 11

4 شافعي، محمد بن إدريس، الإمام، الرسالة: 468، دار الكتب العلمية، بيروت

5 الطحاوي، أبو جعفر، مشكل الأثار : 277/4، دار صادر ، بيروت

6 المحلى:8/ 106

شَهْرِكُمْ هَذَا »[1]

"بے شک تمہارے خون، تمہارے مال، تمہاری عزت و آبرو تمہارے اس دن، اس شہر اور اس مہینے کی حرمت کی طرح تمہارے درمیان حرام ہیں۔"

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مومنوں کے اموال کو ایسے ہی حرام ٹھہرایا ہے جس طرح ان کے خونوں کو حرام کیا گیا ہے اور اس حرمت میں والد سمیت کسی کو بھی مستثنیٰ نہیں کیا گیا۔"[2]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حرمت اموال کو، حرمت ابدان کی مانند قرار دیا ہے جس طرح باپ کے لیے سوائے حقوق واجبہ کے اپنے بیٹوں کے ابدان حرام ہیں، اسی طرح اموال بھی حرام ہیں۔ حقوق واجبہ سے مراد اس کے نفقہ کی ضروریات ہیں۔

② امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 458ھ) اپنے استدلال کے لیے ایک مرسل روایت بھی لائے ہیں جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« كل أحد أحق بما له من والده وولده والناس أجمعين »[3]

اجماع امت

امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"نصوص اور اجماع سے یہ صحیح ثابت ہو چکا ہے کہ کسی آدمی کے پاس غلام اور باندی ہو اور ان دونوں کا والد بھی زندہ ہو تو وہ غلام اور لونڈی اپنے مالک کی ملکیت ہیں، باپ کی نہیں۔"[4]

عقلی دلائل

امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 483ھ) فرماتے ہیں کہ بیٹے کے مال میں باپ کی ملکیت نہیں ہے۔ جس طرح باپ اپنے بیٹے کا مالک نہیں ہے۔ اسی طرح بیٹے کی کمائی کا بھی مالک نہیں ہے کیونکہ بیٹا ہی اپنی کمائی کا حقیقی مالک ہے حتیٰ

1 النيسابوري، مسلم بن الحجاج، أبو الحسن القشيري، صحيح مسلم،كتاب القسامة والمحاربين والقصاص والديات، باب تغليظ تحريم الدماء والأعراض والأموال:1679، دار السلام للنشر والتوزيع، الرياض، الطبعة الأولىٰ، 1999م

2 الطحاوى ، أبو جعفر، شرح معاني الآثار:4/159،عالم الكتب ،بيروت،الطبعة الاولى،1994ء

3 البيهقي، أحمد بن الحسين بن علي بن موسى، السنن الكبرىٰ:7/481، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الثالثة، 2003م

4 المحلى: 8/ 108

کہ اپنے مال میں تصرف کا حق صرف بیٹے کو حاصل ہے کہ وہ اپنی لونڈی سے مباشرت کرے یا اپنا غلام آزاد کر دے۔ بچپن میں والد نگران ہونے کی حیثیت سے بیٹے کے مال میں تصرف کرتا رہتا ہے مگر بیٹے کی بلوغت کے بعد یہ سبب زائل ہو جاتا ہے۔ اب وہ خود اپنے مال میں تصرف کا زیادہ حقدار ہے۔

اگر بیٹے کا مال باپ کی ملکیت ہے تو باپ جب اپنے بیٹے کو ہبہ کرتا ہے تو اس کا مطلب ہو گا کہ وہ خود اپنی ذات کو ہی ہبہ کرتا ہے حالانکہ یہ ایک فضول بات ہو گی جس کا اہل علم میں کوئی بھی قائل نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بیٹے کا مال اسی کی ملکیت ہے باپ کی ملکیت نہیں ہے۔

دوسرا قول

باپ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے مال سے جب چاہے، جتنا چاہے، لے سکتا ہے۔ خواہ باپ کو اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو بیٹا چھوٹا ہو یا بڑا، بیٹی ہو یا بیٹا وہ مال دینے پر خوش ہو یا ناخوش، بیٹے کو باپ کے مال کا علم ہو یا نہ ہو۔ یہ قول صحابہ میں سے عمر بن خطاب، عبداللہ بن مسعود، جابر بن عبداللہ، انس بن مالک، ابن عباس، علی بن ابی طالب اور سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم کا ہے۔

فقہاے تابعین میں سے مسروق بن اجدع، سعید بن مسیب (متوفیٰ 94ھ)، ایک روایت کے مطابق ابراہیم نخعی، عامر شعبی (متوفیٰ 105ھ)، مجاہد، حسن بصری (متوفیٰ 110ھ)، حکم بن عتبہ اور قتادہ بن دعامہ سدوسی (متوفیٰ 118ھ) رحمہم اللہ سے بھی یہی قول مروی ہے۔

فقہا تابعین میں سے یہ قول ابن ابی لیلیٰ، محمد بن عبدالرحمن کا ہے اور متاخرین میں سے امام صنعانی رحمہ اللہ (متوفیٰ 1182ھ) نے حدیث «أنت و مالك لابيك» سے استدلال کرتے ہوئے اسی قول کی تائید کی ہے۔

قرآن مجید سے دلائل

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآىِٕكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ ...﴾[1]

"کوئی حرج نہیں اگر کوئی اندھا یا لنگڑا یا مریض (کسی کے گھر سے کھائے)۔ اور نہ تمہارے اوپر اس میں کوئی مضائقہ ہے کہ اپنے گھروں سے کھاؤ یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے۔"

اس آیت کریمہ میں وجہ دلالت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں پر دس (10) قسم کے لوگ بیان کیے ہیں جن کے گھروں سے کھانا کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ان دس (10) میں اولاد کا کوئی تذکرہ نہیں ہے جیسا کہ

1 سورة النور:24: 61

قرآن مجید میں "أو بیوت أولادکم" کے الفاظ نہیں ہیں کیونکہ اولاد "من بیوتکم" کے حکم میں ہی داخل ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اولاد کے گھر، والدین کے اپنے گھروں کی مانند ہوتے ہیں اس لیے اولاد کے گھروں کا الگ سے ذکر نہیں کیا گیا لہٰذا اولاد کے گھر بھی والدین کے گھر کی طرح حکم رکھتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ حدیث «أنت و مالك لابيك» در حقیقت، کتاب اللہ سے ہی ماخوذ اور اس آیت کے ضمن میں موجود مخفی نتائج اور مضمرات کی تفصیل ہے۔[1]

امام ابن قدامہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹا اپنے باپ کے لیے عطیہ (ہبہ) بنایا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ﴾[2] ''اور ہم نے اسے اسحاق اور یعقوب عطا کیے۔''

لہٰذا جو چیز باپ کو ہبہ کی گئی ہے اس میں باپ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے غلام کی مانند اولاد کا مال بھی لے سکتا ہے۔[3]

حدیث نبوی ﷺ سے دلائل

① ام المومنین سیدۃ عائشہؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور وہ اپنے باپ کے ساتھ اس کو دیئے گئے قرض کے بارے جھگڑا کر رہا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «أنت و مالك لابيك» تو اور تیرا مال تیرے باپ کے لیے ہے۔[4]

② عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہ عن ابیہ عن جدہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور وہ اپنے باپ کے ساتھ جھگڑا کر رہا تھا۔ اس آدمی نے کہا یا رسول اللہ ﷺ یہ (میرا باپ) میرے مال کا ضرورت مند ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: «أنت و مالك لابيك» تو اور تیرا مال تیرے باپ کے لیے ہے۔[5]

③ سیدنا عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دیہاتی شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور کہا کہ میرے پاس مال اور باپ ہے۔ اور میرا باپ میرے مال کا صفایا کرنا چاہتا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«أنت و مالك لابيك» تو اور تیرا مال تیرے باپ کے لیے ہے مزید فرمایا کہ ہماری اولادیں تمہاری بہترین

1 المغني: 288/6

2 سورة الأنبياء:21: 72

3 المغني: 288/6

4 ابن حبان، محمد بن حبان بن أحمد، صحيح ابن حبان، كتاب البر والإحسان، باب حق الوالدين :316/1، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى، 1987م

5 أحمد بن حنبل، إمام، مسند أحمد:6902، مؤسسة الرسالة، الطبعة الأولى، 2001م

کمائی ہیں پس تم اپنی اولادوں کی کمائی سے کھاؤ۔[1]

تیسرا قول

یہ قول بھی دوسرے قول کی طرح ہے کہ باپ اپنے بیٹے کا مال لے سکتا ہے لیکن انہوں نے چند شرائط لگادی ہیں جن کی موجودگی میں باپ اپنے بیٹے سے مال لے سکتا ہے۔ یہ حنابلہ کا قول ہے اور اسی کے مطابق ان کے ہاں فتویٰ دیا جاتا ہے۔[2]

شرائط

① مال بیٹے کی ضرورت سے زائد ہو تاکہ اس مال کو اپنی ملکیت میں لینے سے بیٹے کو ضرر نہ پہنچے کیونکہ ضرر سے منع کیا گیا ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «لاضرر و لا ضرار»[3]

لہٰذا باپ اپنے بیٹے کے ایسے مال کو اپنی ملکیت میں نہیں لے سکتا جو اس کی ضروریات زندگی سے متعلق ہو۔ جیسے کوئی مشینری کہ جس سے وہ روزی کماتا ہو یا تجارت میں راس المال وغیرہ کیونکہ شریعت کی نظر میں انسان کی ضرورت اس کے فرض پر مقدم ہے جو باپ پر بھی بالاولیٰ مقدم ہے۔

چنانچہ فقہاو تابعین میں عطابن ابی رباح مکی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 114ھ) سے منقول ہے کہ باپ کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے مال کو اپنی ملکیت میں لے سکتا ہے بشرطیکہ بیٹے کو اس سے ضرر نہ ہو۔

② باپ وہ مال اپنے لیے حاصل کرے نہ کہ وہ دوسرے بیٹے کو دے دے یعنی ایک کا مال لیکر دوسرے بیٹے کو نہ دیا جائے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ باپ اپنی اولاد میں سے کسی ایک کو عطیہ وغیرہ دیدے اور دیگر کو چھوڑ دے۔[4]

جب باپ اپنے ذاتی مال سے اپنی اولاد میں عطیہ دینے کے لیے کسی کو خاص نہیں کر سکتا تو ایک بیٹے سے مال سے لیکر دوسرے کو دینے کے لیے خاص کرنا بالاولیٰ جائز نہیں ہے۔

③ بیٹے کے مال کو اس وقت اپنی ملکیت بنانا جب کہ بیٹا یا باپ مرض الموت کی حالت میں نہ ہوں کیونکہ مرض کے ساتھ ملکیت بنانے کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔

---

1 مسند أحمد: ج 6 رقم الحديث 6863 مسند عبد الله بن عمرو بن العاص رضي الله عنه

2 المغنی: 288/6

3 ابن ماجة، إمام، محمد بن يزيد، أبو عبد الله، سنن ابن ماجة، كتاب الأحكام، باب من بنى في حقه ما يضر بجاره: 2341، دار السلام للنشر والتوزيع، الرياض، الطبعة الأولى، 1999م

4 البخاري، محمد بن إسماعيل، صحيح البخاري، كتاب الشهادات، باب لايشهد على شهادة جور إذا أشهد: 2650، دار السلام للنشر والتوزيع، الرياض، الطبعة الثانية، 1999م

④ باپ کافر اور بیٹا مسلمان ہو تو اس وقت بھی باپ اپنے بیٹے کے مال سے کچھ نہیں لے سکتا بالخصوص اس وقت جب بیٹا کافر ہونے کے بعد مسلمان ہو جائے اور اس کا باپ کفر ہی پر قائم ہو۔[1]

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 728ھ) فرماتے ہیں :

"اسی سے مشابہ صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ باپ مسلمان ہو اور بیٹا کافر ہو۔ اس صورت میں بھی باپ اپنے بیٹے کے مال سے کچھ نہیں لے سکتا کیونکہ اختلاف ادیان سے ولایت اور وراثت منقطع ہو جاتی ہے۔"

⑤ قول یا نیت سے قبضہ کر لینے سے پہلے بیٹے کے مال میں باپ کا تصرف غیر صحیح ہے اگرچہ غلام ہی آزاد کرنا ہو کیونکہ بیٹے کی اپنے مال پر مکمل ملکیت ہے اور وہ اپنے مال میں تصرف کا اختیار رکھتا ہے۔ الغرض باپ کے لیے ضروری ہے کہ وہ جس شے کو اپنی ملکیت بنانا چاہتا ہے اسے پہلے اپنے قبضہ میں لے اور پھر اس میں تصرف کرے۔ بنابریں باپ اپنے بیٹے کے قرض یا جرمانے کا مالک نہیں بن سکتا کیونکہ وہ ابھی تک قبضہ میں نہیں آیا۔

مذکورہ شرائط کا گہرا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ پہلی شرط ہی اہم ترین شرط ہے جبکہ بقیہ شرائط کا ہر حال اور جملہ معاملات میں لحاظ کرنا ضروری نہیں ہے اور یہ شرائط ہمارے اس مسئلہ کے ساتھ خاص نہیں ہیں۔

خلاصہ کلام

اگر سابقہ اقوال اور دلائل کو بنظر عمیق دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ تیسرا قول پہلے کے موافق ہے کیونکہ انہوں نے باپ کے لئے بیٹے کے مال سے لینے کے مطلق جواز کو چند شرائط کے ساتھ مقید کیا ہے اور بیٹے کو ضرر نہ پہنچنے کی قید لگائی ہے۔

جمہور کے قول سے واضح ہوتا ہے کہ باپ بلا ضرورت اپنے بیٹے کے مال سے نہیں لے سکتا۔ اس قول میں جمہور نے طرفین (باپ، بیٹے) دونوں کی رعایت رکھی ہے۔ باپ کا حق بوقت ضرورت، نفقہ حاصل کرنے کے ذریعے محفوظ ہے اور اس قول میں خاندانی مشکلات کا حل اور ہر فریق کو اپنے ایمان کی زیادتی اور اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر قناعت کرنے کی دعوت دی ہے۔ اس قول سے دل مطمئن ہو جاتا ہے۔

اس بنا پر اگر باپ بیٹے کے مال کو اپنی ملکیت بنانے اور اپنی ضرورت سے زیادہ حاصل کرنے کا مطالبہ کرتا ہے اور بیٹا اس مطالبے کو مسترد کر دیتا ہے تو وہ بیٹا نافرمان اور گنہگار نہیں ہو گا کیونکہ بقدر ضرورت ان پر خرچ کر کے وہ اپنا فریضہ ادا کر رہا ہے اور ان کے حق میں کوتاہی نہیں کر رہا۔

یہ ایک پہلو ہے، اگر دوسرے پہلو سے دیکھا جائے تو علما کرام کا اختلاف رحمت محسوس ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر معاملہ قاضی کے پاس عدالت میں چلا جاتا ہے تو قاضی دلائل، شہادات اور حالات کو سامنے رکھ کر علما

1 ابن تيميه، إمام أحمد بن عبد الحليم، الاختيارات: 178، تحقيق، محمد حامد الفقى، دار المعرفة، بيروت

کے ان اقوال میں سے کسی قول کو احسن اور موافق حالت دیکھ کر فیصلہ دے سکتا ہے۔

باپ کے لیے نصیحت یہ ہے کہ وہ نیکی پر اپنے بیٹے سے تعاون کرے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

« رَحِمَ اللهُ وَالِدًا أَعَانَ وَلَدَهُ عَلَى بِرِّه »[1]

"اللہ اس والد پر رحم کرے جو اپنی اولاد سے نیکی پر تعاون کرے۔"

تاکہ بیٹا بھی اس کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک سے پیش آئے، والد کی طرف سے نیکی طبعی امر ہے جبکہ بیٹا اس کا مکلف ہے۔ اس میں بیٹے کو بھی نصیحت ہے کہ وہ باپ کے ساتھ نیکی اور حسن وسلوک سے پیش آئے اور ان پر خرچ کرنے میں کنجوسی نہ کرے۔ تنگی اور احسان محسوس کیے بغیر بلا مطالبہ ان کو دیتا رہے خصوصاً جب اللہ تعالیٰ نے رزق کی وسعت دی ہو بلکہ والدین کے ساتھ احسان کرنا زیادتی رزق اور طوالت عمر کا سبب ہے جیسا کہ مشہور احادیث میں موجود ہے۔

اسی طرح بیٹا جب محسوس کرے کہ اس کے والدین اس کے مال سے توقع رکھتے ہیں اور وہ بلا عذر اس میں سے لینا چاہتے ہیں تو اسے چاہیے کہ وہ ان کے ساتھ حکیمانہ راستہ اختیار کرے، ان کے ساتھ نیکی کرے اور ان کو غصہ دلانے کا سبب نہ بنے کیونکہ دانا شخص کبھی وسیلوں کا راستہ ختم نہیں کرتا اور نبی ﷺ کے اس فرمان کو پیش نظر رکھے:

« لَا يَجْزِي وَلَدٌ وَالِدًا، إِلَّا أَنْ يَجِدَهُ مَمْلُوكًا فَيَشْتَرِيَهُ فَيُعْتِقَه »[2]

"کوئی شخص بھی اپنے والد کا حق ادا نہیں کر سکتا الا کہ وہ اپنے والد کو غلام پائے تو خرید کر اس کو آزاد کر دے۔"

نیک بیٹے کو چاہیے کہ وہ والدین کی رضا میں اللہ تعالیٰ کی رضا تلاش کرے جیسا کہ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سائل نے ان سے پوچھا "ماحق الوالدين على الولد" کہ بیٹے پر والدین کا کیا حق ہے؟ تو انہوں نے فرمایا:

«لو خرجت من أهلك وما لك ما أديت حقهما»[3]

"اگر تو مال اور اپنے اہل وعیال سے بھی نکل جائے تو تب بھی تو نے ان کا حق ادا نہیں کیا۔"

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے جب والدین سے حسن سلوک کا سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:

"إن تبذل لهما ما ملكت وإن تطيعهما في ما امراك به، إلا أن تكون معصية"[4]

"والدین کے ساتھ حسن سلوک یہ ہے کہ تو اپنی ملکیت میں موجود ہر شے کو ان کے لیے خرچ کر دے اور ان کے ہر حکم کی اطاعت کرے سوائے معصیت کے۔"

---

1 ابن أبي الدنيا، عبدالله بن محمد، الفقه على العيال: 306/1، دار ابن القيم،الدمام، 1990 م

2 صحيح مسلم، كتاب العتق، باب فضل عتق الوالد: 1510

3 ابن أبي شيبة، أبو بكر عبد الله بن محمد، مصنف ابن أبي شيبة، باب ماذكر في برالوالدين: 25413، مكتبة الرشد، الرياض، الطبعة الأولى، 1409هـ

4 الصنعاني، عبد الرزاق بن همام، المصنف عبد الرزاق: 176/5، المكتب الإسلامي، بيروت، 1972م

امام ابن ابی الدنیا رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 281ھ) مرسل سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
"کیا تم جانتے ہو کہ فی سبیل اللہ خرچ کرنے، سے بھی افضل نفقہ کون سا ہے؟ تو صحابہ کرام نے کہا: اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا بیٹے کا اپنے والدین پر خرچ کرنا۔"[1]

والدین کا حق مشاورت

پیدائش سے بلوغت تک اولاد کی کفالت وحضانت، تعلیم وتربیت اور دیگر ضروریات زندگی کی فراہمی والدین کے فرائض میں شامل ہے۔ بلوغت تک کی عمر چونکہ ناپختگی اور محتاجی کی ہوتی ہے اور بلوغت کے بعد انسان کو اپنے شریک حیات کی تلاش ہوتی ہے تو اس کے انتخاب اور اس بارے میں مختلف لوگوں سے مشاورت کرتا ہے لہٰذا اس سلسلے میں اگر کسی کا مشورہ پر خلوص اور جلب منفعت اور دفع مضرت کا حامل ہو سکتا ہے تو وہ والدین کا ہی ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ والدین کی اولاد سے محبت، الفت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ انہیں کسی قسم کے نقصان کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اور وہ اپنی اولاد کو اپنی زندگی کے تجربات کی روشنی میں مشورہ دیتے ہیں جو انسان کی کامیاب زندگی کا سبب بنتا ہے اور دوسری طرف والدین کو یہ حق حاصل ہے کہ اولاد ان کے مشورے کے بغیر قدم نہ اٹھائیں۔ البتہ زندگی کے دو تین کاموں میں تو والدین سے مشورہ انتہائی ضروری ہے مثلاً نکاح وطلاق اور جہاد وغیرہ جیسے مسائل میں جن کی تفصیل بالترتیب حسب ذیل ہے:

شادی میں مشاورت

اولاد کی بلوغت کے بعد سب سے بنیادی مسئلہ شادی ہے جو انسان کی فطری ضرورت ہے۔ عموماً بچوں کی یہ عمر والدین اور اولاد میں شادی کے معاملے میں اختلاف کو پیدا کرتی ہے۔ اس اختلاف کی بنیادی طور پر دو وجوہ ہیں:

ایک وجہ تو خود والدین کی طرف سے ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ بعض والدین اپنے ذاتی اغراض ومقاصد اور خاندانی عصبیت کو مد نظر رکھتے ہوئے بچوں کے لیے رشتے تلاش کرتے ہیں اور اس بات کو مد نظر نہیں رکھتے کہ بچے اب سن شعور اور حالات کو سمجھنے والے ہیں اور آئندہ زندگی بچوں نے خود ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے گزارنی ہے چنانچہ جب ایسے والدین، اپنے مفاد کو اولاد کے مفادات پر ترجیح دینے لگتے ہیں تو اولاد اور والدین کے درمیان جھگڑا اور اختلاف جنم لیتا ہے حتی کہ اگر اولاد والدین کی ضد سے شادی کر بھی لے تو اکثر وبیشتر ایسی شادیاں کامیاب ہی نہیں ہوتیں۔ اس لیے اگر لڑکے کی شادی کے موقع پر انسان ہونے کے ناطے والدین کے دل میں کوئی خفگی ہو تو انہیں فوراً اس ناراضگی کو دور کر دینا چاہیے۔ اس میں جہاں اللہ تعالیٰ رضامندی حاصل ہو گی وہاں خود ان کی اولاد بھی خوش ہو گی اور اپنے والدین کے لیے اولاد ہمیشہ دعا گو رہے گی۔

---

1 الفقه على العيال: 161/1

دوسری وجہ خود اولاد بنتی ہے۔ وہ اس طرح کہ اگر اولاد کی صحیح اسلامی تربیت نہ ہوئی ہو یا جوانی کے جذبات انہیں مدہوش کر رہے ہوں تو وہ اپنے مشفق والدین کو اپنا دشمن سمجھنے لگتے ہیں اور ان کی رضامندی کو اپنے لیے باعث ہلاکت سمجھتے ہیں گویا جذبات کی مغلوبیت اور تربیت کی کمی کی وجہ سے اولاد ضدی بن جاتی ہے اور اس سلسلے میں اپنی من مانی کرنا چاہتی ہے اور والدین سے اختلاف پیدا ہو جاتا ہے حالانکہ والدین کا فیصلہ ہر حال میں ان کے حق میں بہتر ہوتا ہے، ایسے موقع پر وہ بچے نقصان اٹھاتے ہیں جو والدین کا کہا نہیں مانتے۔

مذکورہ وجوہات سے جو حقیقت کھل کر سامنے آئے گی وہ یہ ہے، اگر اولاد کی شادی کا مسئلہ والدین اور اولاد کے درمیان مفاہمت اور مشاورت سے حل کیا جائے تو بہت بہتر ہے۔ اولاد بھی اپنی خواہشات اور مافی ضمیر کو والدین کے سامنے رکھیں اور والدین بھی ان کی خواہشات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے ان کے نفع و نقصان کو سامنے رکھیں گے اور ان کو ایسا مشورہ دیں گے جو دین و دنیا کے لحاظ سے مفید اور قابل تحسین ہو گا۔ گویا والدین کا مشورہ اولاد کو اطاعت کرتے ہوئے قبول کرنا چاہیے۔

البتہ نکاح کے معاملے میں لڑکا خود مختار ہے اور وہ بلوغت اور رشد کی عمر کو پہنچنے کے بعد اپنی شادی کسی بھی لڑکی سے کر سکتا ہے جس سے شادی کرنے میں کوئی شرعی رکاوٹ نہ ہو۔ اس کا سبب یہ ہے کہ شریعت نے لڑکے کے لیے اس چیز کی شرط نہیں لگائی کہ وہ گھر والوں کی اجازت سے شادی کرے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ اسے اپنے والدین اور گھر والوں سے اپنی شریک زندگی کے انتخاب میں مشورہ کرنا چاہیے کیونکہ والدین سے حسن سلوک کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اس کی بڑی تاکید ہے لیکن اگر وہ والدین کی اجازت کے بغیر کہیں بھی اپنی مرضی سے شادی کر لیتا ہے تو اس کا نکاح بہر حال صحیح ہو گا۔ تاہم اس کے برعکس لڑکی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے والدین کی اجازت بالخصوص ولی کی رضامندی کے بغیر شادی نہ کرے کیونکہ اس کے لیے ایسا کرنا حرام ہے اور ولی کی اجازت کے بغیر کیا ہوا نکاح اسلام کی نظر میں منعقد نہیں ہوتا۔

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لانكاح إلا بولي» [1] "ولی کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔"

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

«أَيُّمَا امْرَأَةٍ نَكَحَتْ بِغَيْرِ إِذْنِ مَوَالِيهَا، فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ» ، ثَلَاثَ مَرَّاتٍ «فَإِنْ دَخَلَ بِهَا فَالْمَهْرُ لَهَا بِمَا أَصَابَ مِنْهَا، فَإِنْ تَشَاجَرُوا فَالسُّلْطَانُ وَلِيُّ مَنْ لَا وَلِيَّ لَه» [2]

"جس عورت نے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا تو اس کا نکاح باطل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کلمات تین

---

1 أبو داؤد، سليمان بن الأشعث، سنن أبي داؤد، كتاب النكاح، باب فى الولي: 2085، دار السلام للنشر والتوزيع، الرياض، الطبعة الأولى، 1999م

2 سنن أبي داؤد، كتاب النكاح، باب في الولي: 2083

مرتبہ دہرائے۔ (پھر اسی ممنوع نکاح کے بعد) اگر مرد اس عورت کے ساتھ ہم بستری کرے تو اس پر مہر کی ادائیگی واجب ہے کہ جس کے بدلے اس نے اس عورت سے فائدہ حاصل کیا۔ اگر اولیا کا آپس میں اختلاف ہو جائے تو جس کا کوئی ولی نہ ہو اس کا ولی حکمران ہے۔"

لیکن اس کا یہ قطعاً مطلب نہیں ہے کہ شادی میں لڑکی کا کوئی اختیار ہی نہیں اور والدین جہاں چاہیں اس کا زبردستی نکاح کر دیں بلکہ اسلام نے والدین، لڑکی اور لڑکے کی آپس میں مشاورت کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے والدین اپنے مفادات کے لیے لڑکی پر ظلم کرتے ہوئے اس کی شادی کریں اور نہ لڑکی اپنی مرضی کو والدین پر ترجیح دے بلکہ باہم مشاورت اور مفاہمت سے شادی کے معاملے کو حل کریں۔ والدین لڑکی سے اس کے رشتے کے بارے میں مشاورت کریں۔ اس بارے میں نبی کریم ﷺ کے فرامین حسب ذیل ہیں۔

نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: « لاَ تُنْكَحُ الأَيِّمُ حَتَّى تُسْتَأْمَرَ، وَلاَ تُنْكَحُ البِكْرُ حَتَّى تُسْتَأْذَنَ» قَالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ، وَكَيْفَ إِذْنُهَا؟ قَالَ: أَنْ تَسْكُتَ» [1]

"شوہر دیدہ کا نکاح اس سے اذن طلب کرنے سے قبل نہ کیا جائے اور کنواری کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر نہ کیا جائے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ کنواری اجازت کیسے دے گی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس کی اجازت (مشورہ) اس کا خاموش رہنا ہے۔"

اسی طرح نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: «والبكر تستأذن في نفسها وإذنها صماتها» [2]

"کنواری سے اجازت (مشورہ) لی جائے گی اور اس کی اجازت اس کا خاموش رہنا ہے۔"

ان صریح فرامین رسول اللہ ﷺ کے باوجود اگر ولی اپنی جوان لڑکی کا نکاح کہیں زبردستی کر دیتا ہے تو شریعت کی رو سے اس لڑکی کو وہ نکاح منسوخ کرانے کا حق حاصل ہے۔

حضرت خنساً بنت خذام انصاریہؓ بیان کرتی ہیں: « إِنَّ أَبَاهَا زَوَّجَهَا وَهِيَ ثَيِّبٌ فَكَرِهَتْ ذَلِكَ «فَأَتَتِ النَّبِيَّ ﷺ فَرَدَّ نِكَاحَهَا » [3]

"وہ بیوہ تھیں اور ان کے والد نے ان کا نکاح کر دیا جبکہ وہ اس کو ناپسند کرتی تھیں چنانچہ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں (اور اس بات کا ذکر کیا) تو آپ ﷺ نے (ان کے والد کا کیا ہوا) نکاح رد کر دیا۔"

گویا مذکورہ تمام صریح روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ والدین کو اپنی اولاد سے اور اولاد کو اپنے والدین سے

---

1 صحيح بخاری، كتاب النكاح، باب لاينكح الأدب وغيره البكر والثيب إلا برضاها: 5136

2 الدارمي، أبو محمد عبد الله بن عبد الرحمن، سنن الدارمي، باب المرأة يزوجها الوليان:2188، دار البشائر، بيروت، الطبعة الأولى، 2013م

3 صحيح بخاری، كتاب النكاح ،باب لا يجوز النكاح المكره: 6945

مشاورت کے بعد نکاح کے معاملے کو حل کرنا چاہیے ورنہ شریک حیات کے حوالے سے ناکامی و ندامت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

طلاق

روایات میں ہمیں ملتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مشورے سے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے باپ کے مشورے کی اطاعت کرتے ہوئے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ملنے کے لیے مکہ گئے مگر وہ گھر میں موجود نہ تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کی بیوی سے پوچھا کہ تمہاری زندگی کیسی گزر رہی ہے تو اس نے (بجائے اس کے کہ صبر و شکر کا اظہار کرتی) کہا:

« نَحْنُ بِشَرٍّ، نَحْنُ فِي ضِيقٍ وَشِدَّةٍ، فَشَكَتْ إِلَيْه »

"ہمارا تو بہت برا حال ہے۔ ہم تو بڑی تنگی اور مصیبت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

گویا خوب شکوہ و شکایت کی اس پر ابراہیم علیہ السلام نے کہا: "اچھا جب تمہارا خاوند آئے تو اسے میری طرف سے سلام کہنا اور یہ بھی کہنا کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ بدل لے۔ جب ابراہیم علیہ السلام چلے گئے اور اسماعیل علیہ السلام گھر تشریف لائے تو ان کی بیوی نے ان کے بارے میں بتایا تو اسماعیل علیہ السلام نے کہا کہ وہ میرے والد تھے اور مجھے یہ مشورہ دے گئے ہیں کہ میں تمہیں طلاق دے دوں۔ چنانچہ انہوں نے اس عورت کو طلاق دے دی۔[1]

روایت کے سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے طلاق کا مشورہ اس لئے دیا کہ آپ مہمان کی حیثیت سے ان کے ہاں گئے تھے۔ اور اس عورت نے خاطر تواضع کرنے کے بجائے اپنا دکھڑا سنانا شروع کر دیا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پسند نہ آیا کہ ایک نبی کی بیوی اور ایک نبی کی بہو ہو کر بھی صبر و شکر کرنے کی بجائے جزع فزع اور شکوہ و شکایت کی روش اختیار کرے۔ اور انہوں نے ایسی بدسلیقہ عورت کو اپنے گھرانے کے لائق نہ سمجھتے ہوئے بیٹے سے طلاق کا عندیہ ظاہر کیا جو بیٹے نے پورا کر دیا۔ ایک عمر صبر کے بعد پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ملنے کے لیے گئے۔ اس بار بھی وہ گھر نہ ملے البتہ ان کی نئی بیوی سے ملاقات ہوئی۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے پوچھا۔ آپ کی گزر بسر کیسی ہو رہی ہے۔ تو اس پر عورت نے کہا:

« نَحْنُ بِخَيْرٍ وَسَعَةٍ، وَأَثْنَتْ عَلَى اللهِ »

"ہم خیر و عافیت کے ساتھ ہیں بہت خوشحال ہیں اور اس پر اللہ کا شکر ادا کیا۔"

صحیح بخاری کی اگلی روایت میں ہے کہ اس خاتون نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت کرنا چاہی اور اپنی حالت پر

1 صحیح بخاری، کتاب أحادیث الأنبیاء، باب قول اللہ تعالی واتخذ اللہ إبراھیم خلیلا:3364

اللہ تعالی کا شکر ادا کیا۔

« أَلاَ تَنْزِلُ فَتَطْعَمَ وَتَشْرَب »

"آپ نیچے تشریف رکھیں میں آپ کے لیے کھانے پینے کا بندوبست کرتی ہوں۔"

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے انہیں خیر وبرکت کی دعا دیتے ہوئے فرمایا کہ " جب تمہارا شوہر واپس آئے تو اسے میری طرف سے سلام کہنا اور یہ بھی کہنا کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ قائم رکھے۔

جب حضرت اسماعیل علیہ السلام واپس آئے تو ان کی بیوی نے کہا کہ ہمارے ہاں ایک اچھے بزرگ آئے تھے اور اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خوب تعریف کی پھر اسماعیل علیہ السلام سے کہا کہ وہ آپ کو سلام کہتے تھے اور آپ کو یہ مشورہ دے گئے ہیں کہ اپنی چوکھٹ کو سلامت رکھنا۔ اس پر حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کہا کہ وہ میرے والد صاحب تھے اور مجھے حکم دے گئے ہیں کہ میں تمہیں نکاح میں برقرار رکھوں۔[1] اس طرح ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں :

« كَانَتْ تَحْتِي امْرَأَةٌ وَكُنْتُ أُحِبُّهَا وَكَانَ عُمَرُ يَكْرَهُهَا فَقَالَ: لِي طَلِّقْهَا فَأَبَيْتُ فَأَتَى عُمَرُ النَّبِيَّ ﷺ فَذَكَرَ ذَلِكَ لَهُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: (ياعبدالله) طَلِّقْهَا»[2]

"میری ایک بیوی تھی جس سے میں بہت محبت کرتا تھا جب کہ (میرے والد) حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسے ناپسند کرتے تھے چنانچہ انہوں نے مجھے کہا کہ اس عورت کو طلاق دے دو لیکن میں نے انکار کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا (اے عبد اللہ رضی اللہ عنہ) اس عورت کو طلاق دے دو۔"

واضح رہے کہ بعض کتب میں ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس عورت کو طلاق دے دی۔ اور مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: «أطع أباك» اس مسئلہ میں اپنے باپ کے مشورے کو مان کر ان کی اطاعت کرو۔[3]

مذکورہ بالا دونوں احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ شوہر کو اپنی بیوی کو طلاق دینے سے قبل اپنے والدین سے مشورہ کر لینا چاہیے اور اگر والدین بیوی کو طلاق دینے کا کہیں تو اس کی اگر کوئی معقول وجہ ہو جیسے پہلی حدیث میں وجہ یہ تھی کہ ایک نبی کی بیوی ناشکری کرنے والی اور بے صبر نہیں ہونی چاہیے اور میزبانی میں کسی قسم کی کسر نہ چھوڑنے والی ہونی چاہیے۔ اور دوسری حدیث میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اللہ کے رسول ﷺ سے عرض کیا: « إِنَّ عِنْدَ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ امْرَأَةً كَرِهْتُهَا لَهُ »[4]

---

1 صحيح بخاری، كتاب أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالى واتخذ الله إبراهيم خليل:3365

2 سنن أبي داؤد، كتاب الأدب،باب في بر الوالدين:5138

3 مسند أحمد:ج4 رقم الحديث 4711، مسند عبد الله بن عمر بن الخطاب رضي الله عنهما

4 أيضا:5011

"بلاشبہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ایسی عورت سے نکاح کر رکھا ہے جیسے میں فی الواقع عبد اللہ کے لیے مکروہ خیال کر رہا ہوں۔"

گویا "کرهتها له " کے الفاظ اس کی تائید کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس عورت کو، ابن عمر رضی اللہ عنہ کے دینی اور دنیوی امور کے لیے باعث خطرہ خیال کرتے تھے۔ اور یہ ایک معقول وجہ تھی جس کی بنا پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حمایت کی تھی اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو طلاق دینے کا مشورہ دیا تھا۔ علامہ احمد عبد الرحمن البنا رحمہ اللہ (متوفی 1978م) فرماتے ہیں :

"ظاہر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ عورت اس وجہ سے ناپسند تھی کہ ان کے نزدیک وہ آپ کے صاحبزادے کے لیے موزوں نہ تھی اس معاملے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پیش نظر ضرور کوئی مصلحت ہو گی بالخصوص اس لیے کہ آپ الہام ربانی کے حامل تھے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کو اسی لیے طلاق دینے کا حکم دیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ سمجھتے تھے کہ عمر رضی اللہ عنہ کا خیال صحیح ہو گا۔"[1]

اسی طرح شیخ الحسن محمد بن عبد الہادی سندھی رحمہ اللہ (1138ھ) اس حدیث کی شرح میں رقمطراز ہیں:

"اس حدیث سے معلوم ہوا کہ والدین کی اطاعت خواہش نفس پر ترجیح رکھتی ہے۔ لیکن اس وقت جب والدین کا حکم دین اسلام سے موافقت رکھتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اس عورت کو ناپسند کرنا اور اپنے بیٹے کو اسے طلاق دینے کا حکم اور مشورہ دینا صرف اس وجہ سے تھا کہ اس عورت کے دین و ایمان کی کمزوری آپ کے سامنے ظاہر ہوئی تھی۔"[2]

والدین کے حکم کو بطور مفید مشورہ سمجھتے ہوئے بیوی کو طلاق دینے کے حوالے سے ایک واقعہ حسب ذیل ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے پاس ایک آدمی آیا اور کہنے لگا:

« إن أبي يأمرني أن أطلق امرأتي » "میرے والد نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اپنی بیوی کو طلاق دے دوں۔"

تو کیا میں طلاق دے دوں؟ امام احمد رحمہ اللہ نے اسے فرمایا:

"لا تطلقها" تم اسے طلاق نہ دو۔ وہ آدمی کہنے لگا کہ کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے عبد اللہ رضی اللہ عنہ کو یہ حکم نہیں دیا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے اور پھر حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو طلاق دینی پڑی تو اس پر امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا: «حتى يكون أبوك مثل عمر » [3] "ہاں اگر تمہارا باپ وہ مقام حاصل کر لے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو

---

1 البنا الساعاتي ،أحمد عبد الرحمن ، الفتح الرباني لترتيب مسند الإمام أحمد بن حنبل الشيباني: 17/4، دار الحديث ،القاهره

2 مسند أحمد: 333/8

3 محمد بن مفلح، آداب الشرعية والمنح المرعية: 446/1، جمعية احياء التراث الإسلامي،كويت، 1997م

حاصل تھا تو پھر اس کے مشورے کو حکماً مان لے۔"

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی مذکورہ بات کے دو مفاہیم ہو سکتے ہیں:

ایک تو یہ کہ تقویٰ و پرہیز گاری اور للّٰہیت میں جو مقام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حاصل ہے وہ تیرے باپ کو حاصل نہیں ہے اس لیے تیرے والد کا مطالبہ بغض و عداوت اور حسد و کینہ پر مبنی ہو سکتا ہے۔ دوسرا یہ کہ عمر رضی اللہ عنہ گھر کے سربراہ تھے لیکن یہ مفہوم اس وقت درست ہو گا جب واقعی اس شخص کی رہائش اپنے والدین سے الگ ہو گی یا مشترکہ رہائش میں والد کے بڑھاپے یا کسی قسم کی معذوری کی وجہ سے نظم و نسق کا اختیار اس کے پاس نہ رہا ہو۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کا موقف

اس مسئلہ میں ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1014ھ) کا موقف بالکل دوسرا ہے جیسا کہ وہ رقمطراز ہیں:

"بیٹے پر لازم نہیں کہ وہ والدین کے حکم پر اپنی بیوی کو طلاق دے اگرچہ والدین کو اس کی بیوی (اور اپنی بہو) سے شدید تکلیف ہی کیوں نہ پہنچ رہی ہو کیونکہ والدین کے مشورے پر عمل کرنے میں بسا اوقات خاوند کو ضرر پہنچتا ہے۔ اس لیے والدین کی شفقت کا تقاضا تو یہ تھا کہ اگر وہ اس ضرر کا پوری طرح اندازہ کر لیتے تو وہ بیٹے کو طلاق دینے کا حکم اور مشورہ نہ دیتے۔ اس کے باوجود ان کا طلاق پر اصرار کرنا نادانی ہے جو قابل التفات نہیں۔"[1]

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کی مذکورہ رائے متوازن معلوم نہیں ہو گی کہ وہ اس سلسلہ میں دوسری انتہا پر ہیں کہ کسی بھی صورت، والدین کے کہنے پر عورت کو طلاق نہ دی جائے حالانکہ اگر والدین کا مشورہ اور حکم معقول علت اور مصلحت پر مبنی ہو تو پھر اس مسئلے میں ان کی اطاعت کرنے میں کوئی شرعی مانع نہیں ہے۔

علامہ قاضی ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ اور امام منذری رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ

اس مسئلہ میں قاضی ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 543ھ) اور امام منذری رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 656ھ) نے صحیح راہنمائی فرمائی ہے چنانچہ ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ مذکورہ حدیث کی شرح میں رقمطراز ہیں:

"بیٹے کے لیے اپنے والد سے نیکی اور حسن سلوک کا طریقہ یہ ہے کہ جس چیز کو والد ناپسند کرتا ہے اسے وہ بھی ناپسند کرے اگرچہ وہ اس سے محبت کرتا ہو۔ البتہ یہ بات یاد رہے کہ والد کا مشورہ اور حکم اس وقت ہے جب والد بصیرت و درستگی پر ہو، لیکن اگر ایسا نہ ہو تو پھر والد کو راضی کرنے کے لئے بیوی کو طلاق دینا مستحب تو ہو سکتا ہے لیکن اس طرح واجب ہرگز نہیں جس طرح کہ پہلی حالت (والد کے اصابت رائے) میں واجب ہے کیونکہ والد کے حق پر ہونے کی صورت میں اس کی اطاعت اللہ کی اطاعت کے زمرے میں شامل ہے۔"[2]

---

1 ملا علي قاري، علي بن سلطان، مرقاة المفاتيح شرح مشكوة المصابيح:1/132، دارالفكر، بيروت، الطبعة الأولى،2002م

2 ابن العربي، عارضة الأحوذي شرح صحيح الترمذي:5/164، دار الوحي المحمدي ، القاهره

امام منذری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی سنن ابو داؤد کی تہذیب اور شرح میں من و عن یہی فیصلہ دیا ہے۔[1]

جہاد کے لیے والدین کی اجازت اور ان سے مشاورت

جہاد فی سبیل اللہ کے لیے والدین کی اجازت اور ان سے مشاورت کرنا ضروری ہے اور شارع کے فرامین میں جو "بر الوالدین" کا حکم دیا گیا ہے اس کا یہی مطلب و مقصود ہے۔ اور بر الوالدین کا تقاضا بھی یہ ہے کہ انہیں محتاجی کی حالت میں اکیلے نہ چھوڑا جائے اس ارادے سے کہ جہاد سے افضل عمل ہی نہیں بلکہ والدین کی خدمت ایسی حالت میں افضلیت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ مگر جب جہاد فرض عین ہو جائے پھر جہاد کرنا ضروری ہے اور جہاد تین صورتوں میں فرض عین ہوتا ہے:

① جب حربی دشمن سے جنگ کے لیے انسان میدان میں اتر آئے۔

② جب کفار ملک پر حملہ آور ہو جائیں۔

③ جب حاکم وقت سب کو جہاد کے لیے نکلنے کا حکم صادر کر دے۔

جہاد کے لیے والدین کی اجازت اور ان سے مشاورت کرنے کے دلائل حسب ذیل ہیں:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کون سا عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وقت پر نماز ادا کرنا، پھر دریافت کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنا، پوچھا گیا کہ پھر کونسا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جہاد فی سبیل اللہ۔"[2]

امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ثابت ہوا کہ والدین کے حقوق جہاد پر مقدم ہیں لیکن یہ اس وقت ہے جب جہاد فرض عین نہ ہوا ہو۔[3] اسی طرح حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: « جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَاسْتَأْذَنَهُ فِي الجِهَادِ، فَقَالَ: «أَحَيٌّ وَالِدَاكَ؟» ، قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: فَفِيهِمَا فَجَاهِدْ »[4]

"ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور وہ جہاد میں شرکت کی اجازت طلب کر رہا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تیرے والدین زندہ ہیں؟ وہ بولا ہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان کی خدمت کرنے میں خوب محنت کر (یہی تیرا جہاد ہے)۔"

---

1 المنذري، عبدالعظيم بن عبد القوي، مختصر سنن أبي داؤد، تحقيق محمد حامد الفقي، مكتبة السنة المحمدية، لاهور، 1367هـ

2 صحيح بخاري، كتاب الأدب، باب قول الله تعالى ووصينا الإنسان بوالديه حسنا:5970

3 الشوكاني، محمد بن علي بن محمد، نيل الأوطار: 227/7، دار إحياء التراث العربي، 1999م

4 صحيح بخاري، كتاب الجهاد، باب الجهاد بإذن الأبوين:3004